

Sacha Fankar Part1

"اسے سمیعہ رحیم کا کام دیکھنے میں مزا آتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سمیعہ رحیم کو کام کرتے دیکھ کر اسے ایک عجیب سے لطف کا احساس ہو تا تھا۔ وہ پچھلے پانچ سال سے اس پبیٹ ورکشاپ (پتلی گھر) سے وابستہ تھا اور اس کے سامنے کئی لوگ یہاں کام کر کے یا سیکھ کر جا چکے تھے۔ کئی ایسے بھی تھے جو اس سے پہلے یا اس کے ساتھ ہی یہاں آئے تھے اور تاحال کام کر رہے تھے مگر یہ اتفاق کی بات تھی کہ سمیعہ رحیم سے پہلے اس نے کسی کے کام میں اتنی دلچسپی نہیں لی تھی۔ سمیعہ رحیم کو کام کرتے دیکھ کر احساس ہوتا تھا جیسے اس کے ہاتھ بنے ہی اس کام کے لیے تھے۔ وہ سٹرنگ، راڈ اور بینڈ سب ہی قسم کی کتھ پتلیاں بناتی تھی اور اس مشاقی سے بناتی تھی کہ دیکھنے والے کو ان کی بناوٹ میں کبھی کوئی جھول نظر نہیں آتا تھا۔ اسے صرف ایک بار کہانی کی تھیم اور کردار کی تفصیل بتانے کی ضرورت پڑتی تھی اور باقی کا کام وہ خود کرتی تھی۔ سمیعہ رحیم کے کام میں دلچسپی کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے کسی آرٹ کالج اکیڈمی یا ادارے سے تربیت نہیں لی تھی اس کے پاس گریجویشن کی ڈگری تھی اور وہ بھی عام سے مضامین کے ساتھ جبکہ اسی ورکشاپ میں کام کرنے والے کئی اور لوگ نامور اداروں سے اعلا ڈگریاں اور اسناد لے کر آئے ہوئے تھے خود سعد کے پاس آرٹ اینڈ کرافٹس کے کئی تربیتی کورسز کی اسناد تھیں جن میں سے کچھ اس نے بیرون ملک اداروں سے حاصل کی تھیں مگر ایک عام اور سادہ تعلیم کے ساتھ آنے والی یہ لڑکی سب پر سبقت لے گئی تھی۔ میں ضرورت مندوں کی کینگری میں آتی ہوں۔ ایک دن سمیعہ نے اسے بتایا تھا نوشیرواں ایک نیک دل انسان ہیں، جو کام کی تلاش میں آنے والوں کو کیٹگرائز کرتے ہیں، سیکھنے والے تجربہ حاصل کرنے والے اور ماہر۔ چوتھی کینگری ضرورت مندوں کی ہے، میں نے جب اپلائی کیا تو میرے تعارف پر ضرورت مند کا ٹیک لگا کر ایچ آر کے پاس بھجوا دیا گیا تھا۔ اس نے سادہ سے انداز میں بتایا تھا۔ خیریت۔ سعد نے چونکہ بغیر کہا۔ ضرورت مندی کیسی؟ روزی روٹی کے مسائل اور کیا۔ وہ بے نیازی سے بولی۔ میں نے نوشیرواں سے کہا میرے پاس نہ اعلا ڈگری ہے نہ اونچے الفاظ، میرا تعلیمی پس منظر بھی عام سا ہے، میں کوئی زیادہ اچھی طالبہ نہیں رہی کبھی بھی۔ اگرچہ مجھے اوٹ سٹینڈنگ کہلانے کا شوق تھا؟ مگر میرے امتحان کی رپورٹس پر ہمیشہ ایوریج ہی لکھا ہوا ملتا تھا۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ میں نے کسی آرٹ اینڈ کرافٹ کے ادارے کی شکل بھی نہیں دیکھی، میں نے اس سے پہلے کہیں کام بھی نہ نہیں کیا مجھے میں آپ کو کوئی پروفیشنل اپروچ بھی نظر نہیں آئے گی، مگر مجھے یہ کام آتا ہے۔ آپ مجھے چند روز آزما کر دیکھ لیں، اگر کام ٹھیک ہوا تو ٹھیک ہے ورنہ خدا حافظ کہہ دیجیے گا۔ پھر سعد کے لہجے میں لمحہ بھر کو تجسس ابھرا۔ پھر پتا نہیں کیوں اور کیسے نوشیرواں کے دل میں رحم کے جذبات اٹھنے اور انہوں نے پوچھا، متوقع تتخواہ کیا ہے تمہاری؟ میں نے کہا شروع میں تو بھلے آنے جانے کا کرایہ دے دیجئے گا۔ وہ بولے نہیں ہم اتنے بھی برے نہیں۔ انہوں نے میری غلطیوں سے بھر پور سی وی پر ضرورت مند کا ٹیک لگایا اور حمید صاحب کے پاس بھیج دیا۔ تمہیں دکھ نہیں ہوا "ضرورت مند" کے الفاظ دیکھ کر؟ سعد نے دانستہ پوچھا۔ دکھ کیسا؟ وہ اون کے نیلے گولے کے دھاگے کو انگلی پر لپیٹتے ہوئے بولی۔ میں تو پتا نہیں کہاں کہاں جوئیاں چٹخانے کے بعد یونہی ادھر آنکلی تھی۔ میری قسمت مجھ پر مہربان ہوئی جو نوشیرواں مجھے بیرونی دروازے پر مل گئے ورنہ میری ان تک رسائی کہاں ممکن تھی۔ اس کے لہجے سے قناعت اور شکر گزاری ٹپک رہی تھی۔ انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے تمہاری بات سن لی سعد کو اس کی داستان سننے میں مزا آنے لگا تھا۔ لو میں بتا رہی ہوں نا اللہ مجھ پر مہربان تھا اس رو، اس نے انگلی پر لپیٹے اون کو گول ناک کی شکل دیتے ہوئے کہا۔ اور اگر اللہ مہربان نہ ہوتا تو تم کہاں ہو تیں آج؟ سعد نے مذاق سے اس کی طرف دیکھا۔ میں جس علاقے میں رہتی ہوں وہاں۔ اس نے اون کے بل دیے لمبے دھاگوں کو قینچی سے کٹ لگانا شروع کرتے ہوئے کہا، وہاں زیادہ تر لوگ فٹبال سی کر روزی کماتے ہیں وہاں گوڑا کرکٹ کے ڈھیروں پر تمہیں فٹ بال سینے کے دھاگوں اور چمڑے کے چھوٹے ٹکڑوں کے انبار نظر آئیں گے، میں ان کو جمع کر رہی ہوتی۔۔۔ ارے واہ! سعد کو حیرت ہوئی۔ ان چیزوں کو جمع کر کے تم کیا کرتیں؟؟ ان ہی چیزوں کو جمع کر کے تو ہم اب تک رزق کماتے آئے ہیں۔ سمیعہ نے پرسکون لہجے میں کہا ان ہی سے تو ہمارے ہاتھوں میں بٹر اترتا ہے ان ہی پر مشق کر کر کے تو ہم نے دھاگوں، کٹرنوں اور اون کے ٹکڑوں کو شکل دینا سیکھی ہے۔ ہم! سعد نے اس کے سارے جملے میں سے سوال کرنے کے لیے اسی لفظ کو چنا۔ ہاں ہم۔ وہ ابستہ آواز میں بولی میں اور میری اماں۔ پیٹ کی بھوک انسان کو برائی پر بھی مجبور کر سکتی ہے اور جس کو اس پر مجبور نہیں کر سکتی وہ خود کشی پر بھی مائل ہو سکتا ہے۔!۔۔***" اُٹی وی کے کسی چینل پر ہونے والے مذاکرے کا کوئی شریک کہہ رہا تھا۔ برائی کی طرف مائل ہو یا خود کشی کی طرف راستے تو گناہ کے ہیں۔ خشخشی داڑھی والے ایک مولانا نے فوری فتویٰ صادر کیا۔ مگر سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ وہ عوامل کیا ہیں جو عام انسان کو برائی یا خود کشی کی طرف مائل کر رہے ہیں مذاکرے، مباحثے، گفتگو سب اس ایک نکتے پر ہونا چاہیے جناب اپنے اپنے پراسانٹ ڈرائنگ رومز، ان یخ بستہ مباحثہ رومز میں بیٹھ کر جو بات کی جاتی ہے۔ نقلی ہوتی ہے غیر حقیقی ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی زندگیوں کا قریب سے مشاہدہ ان کے دکھوں کو محسوس کرنے والا دل ان کے حقوق کی پامالی کے خلاف اندر سے اٹھانی جانے والی آواز ان سب کا فقدان ہے۔ ہمارے ہاں جب ہی تو غریب کے مسائل بڑھتے جا رہے ہیں۔ معاشرے میں بے انصافی، ظلم و ستم، معاشی ناہمواری برائی خود کشیاں۔ کوئی تیسرا شریک ایک ایک لفظ چبا کر ادا کر رہا تھا۔ ان سب عوامل پر جن کی آپ صاحبان نے نشاندہی کی ہے ہم تفصیلی بات کریں گے مگر ابھی وقت ہوا ہے بریک کا ہم بریک لیتے ہیں۔ بریک کے بعد ملتے ہیں۔ سوٹ اور ٹائی پہنے مدبرسی شکل کے میزبان نے اپنے مہمان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ بند کر اسے۔ اماں نے سمیعہ کے ہاتھ سے ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول پکڑ کر آف کا بٹن دبا دیا۔ میں سب جانتی ہوں ان کمپنیوں کو یہ یہاں پر اس قسم کی گفتگو کرنے کے بھی پیسے لیتے ہیں۔ کم بخت شرفاء کہلاتے ہیں اور شہرت بھی کما لیتے ہیں۔ ماں! سمیعہ نے اماں کو غور سے دیکھا۔ اس نے بالوں میں مہندی لگانی ہوئی تھی ہاتھ میں موجدنا جس سے ہونٹوں کے بال اکھیڑے جا رہے تھے ہونٹوں پر مسی کے آثار نظر آ رہے تھے، کانوں کی لوہوں پر کئی قسم کے چھوٹے بڑے تاپیس سجے تھے۔ ہاتھوں پیروں کے ناخنوں پر مہندی کا گاڑھا سرخ رنگ چڑھا ہوا تھا۔ لاجونتی نوٹنکی اس کے ذہن سے دو لفظ ٹکراے۔ ہمارے ماں باپ ہمیں اللہ کی طرف سے قسمت سے ملتے ہیں وہ جیسے ہوتے ہیں۔ ان کے ویسے ہونے یا ان کو بدل لینے پر ہمارا اختیار نہیں ہوتا۔ ہمیں انہیں ویسے ہی قبول کرنا پڑتا ہے جیسے وہ ہمیں ملتے ہیں اس کو کبھی کے پڑھے الفاظ یاد آئے۔ نوٹنکی کی شہزادی لاجونتی۔ وہ اپنی ماں کے اس تعارف

تبدیلیاں آجاتی ہیں، سے بچپن سے واقف تھی، پہلے وہ سوچا کرتی تھی کہ وقت کے ساتھ انسانوں کے مزاجوں میں اسے اماں کے اس تعارف پر کبھی بھی دل میں پسندیدگی کے جذبات اُمڈتے محسوس نہیں ہوئے تھے، نہ ہی اماں کا حلیہ اسے کبھی پسند آیا تھا مگر وہ ہمیشہ وقت اور عمر کے ساتھ مزاج میں در آنے والی تبدیلی کی بھی منتظر رہی تھی۔ اس کا بچپن گزرا لڑکپن آیا اور پھر نوجوانی کے بعد وہ جوانی کی چوکھٹ پر بھی اُن کھڑی ہوئی، مگر اماں کا حلیہ اور انداز وہی رہا نہ بڑھتی عمر اسے بدل پائی نہ گزرتا وقت رتی بھر تبدیلی لا سکا۔ نوٹنکی کی شہزادی لاجونتی سدا بہار اور جوان رہنے کے شوق میں بدمذاقی کا ایک چلتا پھرتا نمونہ نظر آنے لگی تھی۔ اس نے اماں کے بڑے بڑے پھولوں والے سرخ لان کے سوٹ پر نظر دوڑائی اور پھر اس کی نظر اس کے پیروں پر پڑی جو سستی پلاسٹک کی سرخ چیلوں میں مقید تھے۔ ارے میں کیا اماں کی شخصیت کا شدید ردعمل ہوں۔ اس نے دیوار پر لگے اُٹینے میں خود کو دیکھا۔ کبھی کبھی مجھے اپنا آپ ماں کی عمر کا اور ماں کا وجود اپنی عمر کا سا لگتا ہے۔ میں نے اس دنیا میں عمر گزاری ہے پتھر جی۔ اب اماں چنے چاٹ کی پالیٹ پر ہاتھ صاف کرتے کہہ رہی تھی سمیعہ نے چونک کر اپنا دھیان اس کی طرف کیا۔ میں اس وقت سے فیلڈ میں ہوں جب یہ رنگ برنگے نام نہیں ہوتے تھے۔ پرفارمنگ ارٹ، سنجیدہ تھیٹر، لچر تھیٹر، پتلی ورک شاپ، صوتی آرٹ، بصری آرٹ اے بتاؤ کمبخت۔ اس نے ہاتھ سے پالیٹ پر بھنکتی مکھیوں کو ہٹاتے ہوئے کہا۔ سارے فن گڈمڈ تھے خلیفہ بشیر کی نوٹنکی میں کیا کیا نہیں پیش کیا گیا۔ اُنے ہائے ہائے۔ اس نے انکھیں موند کر کچھ یاد کیا اور مزا لیتے ہوئے کہا۔ لاہور شہر کے بڑے بڑے فنکار بھی مشق کی خاطر خلیفہ کے پاس آتے تھے۔ یہ جو اب سیکھتے ہیں بڑے بڑے کالجوں اور اکیڈمیوں میں اس وقت خلیفہ سکھاتا تھا۔ لوگوں کو یہ جسے کہتے ہیں چہرے کے تاثرات اور آواز کا اتار چڑھاؤ اور ٹائمنگ یہ سب سکھاتا تھے خلیفہ۔ انٹری کب دینی ہیں اگرٹ کب کرنا ہے، بری سختی ہوتی تھی۔ ایک ایک لمحے کا حساب رکھ کر کام کراتا تھا۔ اور جو چڑھ گیا غصہ خلیفہ کو تو تیری خیر نہیں۔ اس نے قہقہہ لگا کر زانوں پر ہاتھ مارا۔ مجھے کہتا تھا لے پتھر لاجونتی تو تو ہو گئی ہے پرفیکٹ میری سوٹیاں کھا کھا کر پر ان سوروں کا کیا کروں جو نہ سیکھتے ہیں نہ مار کا اثر لیتے ہیں اور ان ٹیلی ویژن والوں کو دیکھو ان کو لے لیتے ہیں ہاتھوں ہاتھ۔ یہ سن کر کہ خلیفہ بشیر کے شکر در شاگرد ہیں۔ قسم اللہ پاک کی۔ جب ان کی آوازوں کے جھول سنتا ہوں اور شکلوں کے چہہ دیکھتا ہوں، اُٹے والے ڈرامے میں تو بس نہیں چلتا کہ کس کس کے چیپڑیں ماروں دس گنوں ایک بھی نہ۔ سمیعہ یہ گفتگو کئی سالوں سے سنتی آری تھی جن لوگوں کے بارے میں اماں بتاتی تھی کہ بشیر کے شاگرد رہ چکے تھے اور جن کو رکھ رکھ کے چیپڑیں مارنے کو اس کا دل چاہتا تھا۔ اب ملک کے نامور سینئر آرٹسٹ تھے۔ پہلے جب بہت سے پروڈکشن ہاؤسز نہیں کھلے تھے اور اتنے زیادہ چیپلز بھی نہیں تھے۔ پی ٹی وی کے ہر دوسرے ڈرامے میں وہ نظر آتے تھے اور اب جب چیپلز اور ڈراموں کی بھرمار تھی۔ ہر چیپلر وہی چہرے سجے رہتے تھے اور اہاں جو خلیفہ کی سوٹیاں کھا کھا کر پرفیکٹ ہو چکی تھی اس کا وقت سستے تھیٹر ڈراموں میں ملوں ٹھیلوں میں لگنے والی نوٹنکیوں اور سرکس میں ہونے والے فضول رقصوں میں گزرتا تھا۔ وہ اتنی پرفیکٹ تھی کہ معمولی سائیڈ رولز پر بھی سمجھوتے کر لیتی تھی اور بڑے شوق سے انہیں ادا بھی کر لیتی تھی اور جو شاہنور اسٹوڈیوز کے قصبے سناتے نہیں تھکتی تھی، سمیعہ نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ ان اسٹوڈیوز کے قریب بھی کوئی اسے پھٹکنے دیتا۔ میری ماں پرچھائیوں کی دنیا میں رہتی ہے۔ اب وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئی تھی۔ پہلے جو اس کی خواہشات تھیں۔ اب وہ پرچھائیاں بن گئی ہیں اور وہ ان میں رہتی، خوش ہوتی اور مزے لیتی ہے۔ اسے اس سے باہر نکلنا اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ جب بھی ان سارے کاموں سے اماں کو فرصت ملتی تو وہ محلے سے باہر کھلے میدان کے کچرے کے ڈھیر سے چمڑے کے چھوٹے ٹکڑے، دھاگے اور کپڑے کی دھجیاں چنتی رہتی۔ ان چیزوں کو گھر لے جا کر ترتیب سے رکھتی۔ ان پر بھی جمی مٹی جھاڑتی اور پھر اپنے ہاتھوں کے ہنر سے ان کو نئی شکلیں دینے میں مصروف ہو جاتی۔ یہ وہ واحد مشغلہ تھا جس میں سمیعہ نے ہمیشہ دلچسپی لی۔ پہلے پہل اماں ان چیزوں سے کھیلنے کے لیے گڑیا بنا کر دیا کرتی تھی۔ پھر ان معمولی اور بے کار چیزوں نے کچھ اور شکلوں کا روپ دھارنا شروع کر دیا۔ بطخ، طولا، بلا، چھوٹی سی لڑکی، بڑھیا، بابا، چڑیا، سمیعہ کی دلچسپی اور بھر گئی۔ یہ بولتے نہیں ہیں اماں؟ وہ شوق سے پوچھتی۔ بول سکتے ہیں کیوں نہیں بولتے۔ اماں نے ان چیزوں کو دستانوں کی شکل میں بنانا شروع کر دیا پھر ہاتھ پر چڑھا کر وہ مختلف آوازیں نکال کر ان سے جان دستانوں میں آواز ڈالتی۔ یہ کھیل سمیعہ کا پسندیدہ کھیل بن گیا۔ اس کا موڈ اچھا ہوتا تو وہ ان شکلوں کو پتلی ٹوریوں یا تاروں سے جوڑ دیتی جن کو ہلانے سے یہ خدو خال حرکت میں آجاتے اور ایک نیا تماشا شروع ہو جاتا۔ سمیعہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ خلیفہ بشیر کی ہونہار شاگرد نے اس کام میں بالآخر مہارت حاصل کر لی تھی جو خلیفہ بشیر نے اسے بھی سکھایا ہی نہیں تھا! '***' 'شہزادی اور مینڈک، کیا کہانی ہے یار مگر اس کو پتلی کہانی میں تبدیل کرنا ذرا ٹیڑھا کام ہے۔ سعد نے سمیعہ کو بتایا تھا۔ کیوں؟ سمیعہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ سمیعہ کی سمجھ میں نہیں آئے گی یہ بات۔ انجیلا ابراہیم نے اس گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا تھا۔ انجیلا ورکشاپ کی سب سے زیادہ پڑھی لکھی آرٹسٹ تھی۔ Mimicing (نقالی) اور ڈانیا لگ ڈلیوری میں اسے کمال حاصل تھا۔ سمیعہ دیسی کہانیوں کے دیسی کردار بنانے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں جانتی۔ انجیلا کا سمیعہ کے ساتھ رویہ ایسا ہی ہو تا تھا جیسا ترقی یافتہ ملکوں کا غیر ترقی یافتہ ملکوں کے ساتھ۔ کہانی کیا ہے؟ سمیعہ نے انجیلا کی بات پر توجہ دیے بغیر قریب کھڑے سفیان سے پوچھا تھا۔ لیجنڈری فیوری ٹیل۔ سفیان نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا تم نے کبھی پڑھی ہیں پریوں کی کہانیاں سمیعہ؟ اس کے چہرے پر ایسا تمسخرانہ تاثر تھا جیسے اس کو یقین ہو کہ سمیعہ نے کبھی بھی پریوں کی کہانیاں نہیں پڑھی ہوں گی۔ پریوں کی کہانیاں۔ سمیعہ نے زیر لب دہرایا۔ پڑھی نہیں ہیں مگر پریاں دیکھی ہیں۔ واؤ زبردست سفیان اور انجیلا کے منہ سے ایک ساتھ ہنسی چھوٹی۔ کہاں؟ چونگی اور سدھو کے اردگرد یا پھر باغبان پورہ کی فضاؤں میں؟ کیا مطلب؟ سمیعہ نے ان کی طرف دیکھا اس کے انداز میں معصومیت تھی، یقیناً ان کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کینچی اسٹاپ پر یا پھر پکی ٹھٹی کی ہواؤں میں اڑتی پریاں۔ سفیان نے گردن اور دبا کر بازو دائیں بائیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ میں سمجھی نہیں۔ سمیعہ نے سر ہلایا۔ کسی ایسے ہی علاقے کی رہائشی ہو گی نہ تم، تو پریاں بھی تو وہاں ہی نظر آتی ہوں گی تمہیں، انجیلا نے ناک سکورتے ہوئے کہا۔ ایسے علاقوں میں پریاں نہیں جہاز اکثر نظر آتے ہیں۔ سفیان نے تمسخر اڑانے کے سے انداز میں انجیلا کو بتایا، جہاز، یونو۔ اس نے نشہ بازوں کے سے انداز میں انکھیں چڑھا کر لڑکھڑاتے ہوئے بتایا۔ کیا علاقے ہوں

چلی گئی۔ سمیعہ گے یہ بھی۔ انجیلا نے انتہائی حقارت سے کہا اور جھرجھری لے کر ہال کے دوسرے کونے کی طرف نے ایک نظر ہال میں موجود سب لوگوں پر ڈالی جن میں سے زیادہ تو زیر لب مسکرا رہے تھے اور پھر نظریں جھکا لیں۔ میں اس سب کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ اس روز لنچ بریک میں سعد نے سمیعہ کی ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ تم کیوں؟ اس نے اپنا لنچ باکس پیگ سے نکال کر میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ تم نے تو کچھ نہیں کہا تھا۔ اس نے لنچ باکس کا ڈھکن کھولا۔ ڈبے کے اوپر والے حصے میں آلو کا کوئی خشک سالن تھا۔ مگر یہ غلط ہے، بہت غلط ان لوگوں کے دماغ خراب ہیں۔ سعد کی خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ معذرت کیوں کر رہا تھا۔ بونے دو کیا فرق پڑتا ہے۔ سمیعہ نے ڈبے کا نیچے والا حصہ کھولتے ہوئے کہا، جس میں ٹھنڈی سوکھی ہوئی دو روٹیاں رکھی تھیں۔ سعد کو اس کا سالن دیکھ کر خیال آیا وہ سب لنچ بریک میں سب وے، یا پیزا ہٹ جانے کے عادی تھے۔ جا نہیں سکتے تھے تو کھانا ڈیلیور کروا لیتے تھے اور ایسے میں بہت سوں کا بچا ہوا یہاں کے گیٹ کثیر چبڑاسی اور صفائی کرنے والوں کے پیٹ میں جاتا تھا سب اچھا اور خوب کھاتے تھے۔ ایسے میں سمیعہ کا یہ گھریلو سا لنچ باکس اور عاجزانہ کھانا بہت مختلف لگ رہا تھا۔ اس پر کون سا محاورہ فٹ بیٹھتا ہے۔ اس نے یاد کرنے کی ناکام کوشش کی مگر اسے یاد نہیں آیا۔ کھاؤ گے؟ سمیعہ نے کسی بچکچاہٹ کے بغیر اسے دعوت دی۔ سعد نے ایک نظر آلو کے سالن پر ڈالی جس پر ٹھنڈا ہو جانے کی وجہ سے گھی کی ہلکی سی تہ جم گئی تھی اور وہ ٹھنڈی روٹیاں جن پر کالی چٹیاں تھیں۔ شکر یہ، پلیز تم کھاؤ۔ اس کا جسم و ذہن جھرجھری کھانے ہی لگا تھا مگر اس نے خود کو قابو میں کر لیا۔ اچھا اس نے سادگی سے کہا اور ٹھنڈی روٹی کے چھوٹے لقمے توڑ کر سالن سے لگا کر کھانے لگی۔ میں تمہیں The princess and frog شہزادی اور مینڈک کی کہانی سنانا چاہ رہا تھا۔ سعد صبح والے واقعے کی تلافی کرنا چاہ رہا تھا۔ ہاں سناؤ۔ اس نے بدستور کھانے کی طرف دھیان رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اسے کہانی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی سناتا رہا اور وہ کھانے میں مصروف سنتی رہی۔ اس کی کہانی سمیعہ کے کھانے کے ساتھ ختم ہوئی۔ دونوں روٹیاں کھانے کے بعد اس نے میز پر دھرے ٹشو پیپر کے ڈبے سے ایک ٹشو پیپر نکال کر ہاتھ صاف کیے اور دوسرے سے انکھیں۔ مرجیں بہت تھیں۔ اس نے سعد کو بتایا۔ اور کہا تو ایسے رہی تھی جیسے بہت مزے کا کھانا ہو سعد کو حیرت ہوئی۔ وہ سوں سوں کرتی کا غذ کے گلاس میں پانی بھر لائی اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ پنسل پکڑ کر سامنے رکھے کاغذ پر کچھ کام کر رہی تھی۔ مینڈک تو ایسا ہونا چاہیے۔ پندرہ منٹ کے بعد اس نے وہ کافر سعد کے سامنے رکھا۔ ایک بے مثال پتلی کا خاکہ اس کے سامنے تھا۔ سعد حیرت زدہ رہ گیا۔ '***'، 'اماں! تمہاری سرکس کے لیے نکلی ہے۔ یہ جابی دے گئی ہے دروازے کی۔ گھر کے سامنے پہنچنے پر دروازے کو تالا لگا دیکھ کر سمیعہ کا سر چکرانے ہی لگا تھا کہ سامنے گھر کی کھڑکی کھول کر خالہ شمیم نے اسے سر نکال کر اسے بتایا تھا۔ لکی والوں کا بے یا پتہ نہیں قازقستانی والوں کا مجھے نہیں معلوم خالہ شمیم نے اپنے تمباکو والے دانت نکوستے ہوئے بتایا۔ لکی بو یا ان لکی قازقستانی بو یا جاپانی کیا فرق ہے۔ رزق آیا ہے یہ کہنا چاہیے۔ سمیعہ نے گہرا سانس لیا اور تالا کھولتے ہوئے اس عمارت پر نظر ڈالی جو کئی منزلہ، شکستہ اور قریب الخاتمہ تھی، اس تنگ گلی کی اکثر عمارتیں ایسی ہی تھیں بلند و بالا تنگ و تاریک چھوٹے چھوٹے کئی مکانوں اور سینکڑوں نفوس کو خود میں سمائے ہوئے۔ یہ علاقے، یہ گلیاں یہ بے شمار مکان اور ان میں بسنے والے ہزاروں نفوس کیا مینڈک دنیا کا حصہ کہلا سکتے ہیں۔ اس نے سوچا۔ ایک ایک کمرے کا مکان اور رہنے والے بیس بیس، اوہ خدا میں جہاں سے یہاں آتی ہوں اور یہاں سے جہاں جاتی ہوں وہ تصویر کے دور رخ کیوں نظر آتے ہیں، جیسے کسی نے جادو کا ڈنڈا گھما کر منظر بدل دیا ہو۔ اس نے دروازہ کھولا اور نیم تاریک کوٹھری نما کمرے میں داخل ہوئی۔ اتفاق سے بجلی گئی ہوئی نہیں تھی۔ بٹن دبائے پر ساٹھ کا زرد بلب روشن ہو گیا اور کمرے کا قدیم سا منظر واضح ہوا دونوں چارپائیوں کے بستر اسی طرح پر شکر تھے جیسے وہ صبح چھوڑ کر گئی تھی۔ انگٹھی پر رکھی چیزیں بے ترتیب تھیں۔ واحد کرسی، 'n' پر بلیچ کریم کی شیشی کھلی پڑی تھی اور اس کے ساتھ آنے والی پلاسٹک کی چھوٹی سی پلیٹ نما شیٹ پر ادھ بجی تیار کریم پڑی سوکھ رہی تھی۔ اس کے دھبے کرسی پر جا بجا لگے تھے۔ چولہے پر جانے کی دیچی ویسے ہی دھری تھی جس میں پتی سوکھ رہی تھی جانے کے کپ ویسے ہی چھوٹے تھے۔ ایک دیگچی میں نیم گرم پانی رکھا تھا یقیناً اس پانی سے چہرے کو بھاپ دی گئی ہو گی کیونکہ اس کے قریب ہی چھوٹا میلا تولیہ رکھا تھا۔ اوہ ماں! سمیعہ نے انکھیں بند کر کے گہرا سانس لیا۔ تیرے خلیفے نے تجھے سلیقہ سبھاؤ کچھ نہیں سکھایا، مگر وہ بھی کیسے سکھاتا۔ اس نے سوچا۔ یہ پرفارمنگ آرٹ کا حصہ نہیں ہیں نا یہ تو پیدائشی جرثومے ہیں جس میں ہوں وہ مشکل میں جس میں نہ ہوں وہ آسانی میں۔ اس نے اکتانے ہوئے انداز میں بکھری چیزیں سمیٹنا شروع کیں۔ سستی اور عام سی لپ اسٹکس اور میک اپ کٹ بغیر ڈھکن کے چارپائی کے نیچے لڑھک رہی تھی۔ سمیعہ نے تصور میں لاجونٹی نوٹڈکی کی شہزادی کا چہرہ دیکھا لال، نیلے سنہرے رنگوں سے سجا شوخ بھڑکیلے چست لباس میں جکڑا جسم لال یا سنہرے بند جوتوں میں بند پیر اور بڑا سا سرخ یا سنہرا شولڈر بیگ، پیشانی پر بلیچ کیے ہوئے بالوں کے گچھے کانوں اور گلے میں سرخ سنہرے موتیوں سے مزین بندے اور بار۔ اماں سے زیادہ تو وہ تاروں، ڈنڈوں اور ہاتھوں پر ٹھرنکی پتلیاں ہی ڈیسٹ لگتی ہیں۔ اس نے جلے دل سے سوچا۔ ایک گھنٹے کی مشقت کے بعد وہ کمرے کو کسی نسبتاً قابل قبول شکل دینے میں کامیاب ہوئی تھی۔ آٹے کے ٹین سے بچا کھچا اٹا لے کر گوندھنے کے بعد اس نے اپنے لیے ایک روٹی پکائی اور آدھے بچے ملک پیک کے دودھ سے ایک پیالی چائے بنائی۔ ایک سچے آرٹسٹ کا دکھ۔ اس نے روٹی چائے میں ڈبو کر کھاتے ہوئے سوچا۔ دھواں زدہ دیواریں زرد روشنی، ناکافی سامان، سوکھی روٹی اور کالی چائے۔ کٹھ پتلی گری کی تاریخ میں جب میرے روشن نام کا ذکر ہو گا تو میرے اولین دنوں کی پیس ماندگی کا تذکرہ بھی ضرور کیا جائے گا۔ ایک ایسی کٹھ پتلی گر جسے کٹھ پتلیاں بنانے کے علاوہ کہانی لکھنے، ترجمہ کرنے، ہدایات دینے لائٹ افیکٹس اسٹیج بیک گراؤنڈ اور ڈائلاگ ڈیلیوری میں بھی مہارت حاصل تھی، مگر اسے مناسب موقع نہیں ملا وہ پتلیاں بنانے، اپنی غربت سے لڑنے، مشقت کرنے، خون تھوکتی مرگئی۔ اس کی سوچیں کہاں سے کہاں چلی گئیں۔ اور پھر اسے یاد آیا۔ اب تو خون تھوکنے والی بیماری ان نہیں ہے، آج کے زمانے میں آرٹسٹ گمنامی میں کہ نامعلوم بیماری سے مرگنی ہی لکھا جائے گا۔ اس نے فیصلہ کیا۔ اور میرے خاندانی پس منظر کے بارے میں کیا لکھا جائے گا؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ خاندان بے کون سا سوائے اماں کے، اسے دل میں چھین سی محسوس ہوئی۔ اسے اپنے باپ کے بارے میں صرف اتنا پتا تھا کہ وہ بھی خلیفے بشیر کے فن کدے میں میک اپ آرٹسٹ تھا۔ ذات کا نائی تھا، پہلے فروق آباد (فاروق آباد) کے

تھا۔ پھر لہور (لاہور) آگیا تو کسی فٹ پاتہ پر میز شیشہ جوڑے لوگوں کی حجامتیں بناتا تھا۔ اماں نے اسے کئی بار بتایا خلیفہ بشیر کی کھولی میں رہنے لگا جب خلیفہ کو پتہ چلا کہ حجامتیں بنا سکتا ہے تو اسے میک اپ کا سامان بھی لا دیا اور ابا تیرا بن گیا رحیم میک اپ والا۔ اماں کے لیجے میں نجانے کیوں ابا کے لیے حقارت ہی ہوتی تھی۔ وہ تو تھا نائی اور اماں تم۔۔۔ تم کیا تھیں؟ سمیعہ کا کئی مرتبہ دل چاہتا کہ اماں سے پوچھے۔ تمہارا خاندان میں باپ بہن بھائی؟ مگر وہ کبھی نہ پوچھ پٹائی۔ اسے یقین سا تھا کہ اماں کبھی بھی سچ نہیں بتائے گی۔ کبھی اسے وہم گزرتا کہ اس کے پوچھنے پر اگر اماں نے ترنگ میں آکر سچ بتا بھی دیا تو اس سچ میں کچھ ایسی تلخی ہو گی جس کو سن کر اس کی روح تک کڑوی ہو جائے گی۔ نوٹ گن گن کے بھجواتا تھا تیرا باپ فروق آباد اپنے ابا کے پر وہاں سے کبھی کوئی خبر نہ آئی کہ مل گیا ہے روپیہ پھر ایک دن گیا ملنے۔ اماں زیر لب مسکرا کر بتاتی۔ وہاں جا کر پتہ چلا ابا تو دو سالوں کا مر گیا ہوا تھا، نوٹ سارے ڈا کیا اپنے جھوٹے دستخط ڈال کر بڑب کر جاتا تھا' بے چارہ روتا دھوتا واپس آگیا۔ اپنے ابا کے علاوہ اس کا کوئی تھا ہی نہیں۔ اماں تو اس کی کبھی کی مر چکی تھی نہ کوئی بہن نہ بھائی نہ کوئی آگاہ نہ پیچھا' بس پھر لگ کے یہاں کرتا رہا میک اپ، بڑے سچ بن کر نکلتے تھے خلیفہ کے تھیٹر کے فنکار۔ اسٹیج پر بادشاہ اکبر بنا تھا (حال کے ایک معروف سینئر آرٹسٹ کا نام ہے کر) ایک ڈرامے میں۔ واہ واہ کیواں تھی اطلس کم خاب (کمخواب) کی زری کا پاجامہ، نیچے ہائے (ہائے) کے بوٹ تیرے ابا نے اسے سچ سچ کا بادشاہ بنا دیا تھا۔ بادشاہ اکبر ہائے کے بوٹ پہنتا تھا۔ سمیعہ ہنسنے ہنسنے بے حال ہو جاتی۔ کیا ڈائریکٹر تھا خلیفہ بشیر کیا بات تھی اس کی۔" ہائے کے نہیں تو سروس کے ہوں گے۔ اماں اس کے ہنسنے کی وجہ سمجھے بغیر صفائی دیتی۔ خالص چمڑے کے تھے بند بوٹ، سر پر گنے کا تاج سنہری پنی سے اسے ڈیک ریٹ (ڈیکوریٹ) کیا گیا تھا، سوئے بازار سے موٹی اور نگ منگائے تھے خلیفہ نے اسے ڈیک ریٹ (سجائے) کرنے کے لیے۔ سمیعہ اس بادشاہ اکبر (جو کوئی بھی وہ تھا) کا با آسانی تصور کر سکتی تھی۔ تیرے ابا نے شہری بال رنگے تھے اس کے۔ کالی مونچھیں، گلے میں مونٹیوں کے ہار انگلیوں میں نگ جڑی انگوٹھیاں، جب وہ زور سے بولتا شیخو، اماں رعب دار آواز میں بولتی تو مجمع لرز جاتا تھا سانس لینا بھول جاتا تھا: تو عوام کو تب چلتا جب اکبر بادشاہ مر کے نیچے گر جاتا کہ ڈرامہ ختم ہو گیا پھر وہ تالیاں پبٹی جاتیں وہ تالیاں وہ سیٹیاں کہ اللہ کی پناہ ہاؤس فل پروگرام کیے خلیفہ نے بھائی لاہور اور مصری شاہ میں۔ او ہو ہو! سمیعہ متاثر نظر آنے کی کوشش کرتی اور اماں خوش ہو جاتی گویا اس نے آغا حشر کے کسی ڈرامے کی روئداد سنائی ہو۔ بھائی لوہاری سے ہی اٹھے ہیں یہ سب جنے۔ پھر وہ سمیعہ کو خبر دیتی۔ محمد رفع بھی ادھر کا ہی رہنے والا تھا۔ اس نے انکشاف کیا۔ اسے کبھی خلیفہ بشیر نے ہی فنکار بنایا ہو گا۔ سمیعہ ناک سکڑتی۔ اُنے ہائے خلیفہ تو کاکا ہو گا ابھی جب محمد رفیع گلوکار بن کر یہاں سے اڑ بھی گیا۔ خلیفہ تو ہمیں کہانیاں سناتا تھا' اودھے شنکر گروپ کی' پرتھوی تھیٹر کی، انڈین پیپل تھیٹر کی۔ واہ واہ کیا زمانے تھے تھیٹر کا کام صاف ستھرا تھا بڑا' اب جو گڈو والیاں ساری آگنیں تھیٹر میں کام کرنے۔ گند ڈال دیا تھیٹر میں۔ اماں ماضی سے حال میں واپس آکر غصے میں کہتی۔ اور تم کون اماں؟ وہ ایک سوال ایسے موقعوں پر بھی سمیعہ کے اندر سر اٹھانے لگتا۔ تپری واس' پکھی واس' گڈو والی، نوٹنکی کی شہزادی لاجوئی۔ اس کے گرد اس سوال کے جواب کی بازگشت گردش کرنے لگتی۔ کچھ بھی ہوا ماں فن کی تاریخ کا ایک حصہ ہے، وہ ایک ایسی فنکارہ ہے جس پر اگر کسی کہانی کے بھوکے صحافی کی نگاہ پڑ جائے تو اس کی شخصیت کو لیپ پوٹ کے آرٹس کونسل کے میوزیم کی دیوار پر یوں سجا دے جیسے پلاک کے میوزیم کی دیوار پر سجا چھنگ کا پنکھا۔ سمیعہ نے اپنی سوچوں کی دنیا سے نکلنے سے پہلے آخری بات یہ سوچتی تھی۔! '***' 'نوشیرواں کے ساتھ شہزادی اور میٹنگ کے لیے تبادلہ خیال کرتے ہوئے سب ٹیم ممبرز اپنی اپنی سوچ پیش کر رہے تھے۔ یہ پتلی تماشا پیٹ ورکشاپ کے ذہین ترین دماغوں کی ٹیم تھی جس کا ہر ممبر دوسرے سے الگ تکنیکی مہارت کا حامل اور اپنے کام کا اعلا سند یافتہ تھا۔ مستند اور ماہر ارکان کی اس ٹیم کا ممبر سوسائٹی کے جدید روشن خیال اور امیر ترین طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ کہانی کے بنیادی خیال سے لے کر، مکالمہ نویسی مکالمہ بازی، ہدایات، روشنیان صوتی تاثرات گتہ پتلیوں کی بنادٹ لمحہ لمحہ حرکات و سکنات باریک ترین پہلوؤں پر تفصیل سے گفتگو کی گئی۔ تمام نکات لکھے گئے گرافکس ترتیب دیے گئے اور کام شروع کرنے کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ یہ ایک طویل میٹنگ تھی۔ اور اگر اورنج جوس کے ساتھ تم کو کچھ اور چاہیے لطف اندوز ہونے کے لیے تو میں کچھ پیش کروں؟ میٹنگ کے بعد نوشیرواں کے ساتھ اکیلے بیٹھے ہوئے سعد نے نوشیرواں سے سوال کیا۔ یقیناً؟" نوشیرواں نے اپنی فرینچ کٹ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت مسرور اور شادان نظر آ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اپنے کہاتے میں ایک اور کامیاب پتلی ڈرامہ آتے دیکھ رہی تھیں۔ سعد نے سمیعہ کا بنایا میٹنگ کی پتلی کا خاکہ اس کے سامنے رکھا۔ ونڈر فل، زیردست نوشیرواں کا اورنج جوس حلق میں اٹک گیا جسے بمشکل اس نے حلق سے نیچے اتارنے کے بعد کہا۔ میں جانتا ہوں یہ زیردست ہے۔ سعد نے اسے بتایا، مگر کیا یہ تمہارے معیار پر پورا اترتا ہے؟ کس کا آئیڈیا ہے تمہارا؟ نوشیرواں نے عینک آنکھوں پر جما کر غور سے خاکے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اپنی رائے دو تفصیل سے۔ سعد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ سادہ ترین لفظوں میں اسے شان دار کہا جاسکتا ہے۔ نوشیرواں نے خاکے والے کاغذ کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ تم بس کام شروع کر دو اس پر۔ اور اگر میں ایسا ہی شان دار کام باقی کرداروں پر بھی کردوں تو، تمہاری کری ایٹو آرٹ ٹیم ناراض تو نہیں ہو جائے گی؟ سعد نے اسے دیکھتے ہوئے رک رک کر اپنی بات مکمل کی۔ ہوں، نوشیرواں نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے غور کیا، کیا تم اپنے آئیڈیا کو ٹیم ورک میں تبدیل نہیں کر سکتے، ممکن ہے کہ اس طرح کام کرنے سے تمہیں مزید آئیڈیاز ملیں۔ مثلاً کس سے؟ سعد کو نوشیرواں کے جواب کا علم تھا مگر پھر بھی اس نے پوچھا۔ مثلاً انجیلا سے شہزاد سے اور فیصل سے، شاید تہمینہ سے بھی نوشیرواں کے لیے اس کے تخلیق کاروں کی ٹیم بہت اہم تھی اور وہ ان پر ناز بھی کرتا تھا۔ کیا تمہارے اسپانسرز اس بات پر اعتراض کریں گے کہ تم نے کس سے کیا کام لیا؟ سعد کو اپنے اس سوال کا جواب بھی معلوم تھا مگر اس نے پوچھا۔ نہیں یہ ہمارا اپنا معاملہ ہے۔ پھر اپنی ٹیم کو کوئی اور کام سونپ دو کچھ عرصہ کے لیے اور مجھے اس کہانی پر کام کرنے دو۔ سعد نے اس کے چہرے کے تاثرات جاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔' (جاری ہے)"]